ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث نبویہ پر محدثین کرام رحمۃ اللہ کے حوالے سے پیش کردہ درایتی نقد کی حقیقت

SAHIH BUKHARI AND SAHIH MUSLIM ON THE PROPHETIC HADITHS PRESENTED BY MUHADDITH SAIN, MAY GOD BLESS HIM AND GRANT HIM PEACE

FAZL UR Rahman
Senior Theology Teacher Government High School Saro Shah Mardan (KPK)
Fazalkhaniiui@gmail.com
Raznan Bibi
Ph.D Scholar at Qurtuba University of Science & Information Technology Peshawar. Islamic Studies
Syedaraznan88@gmail.Com

Abstract:

The deniers of hadith also cite a few hadiths which, in their opinion, have been declared unacceptable by the Muhadditheen because they do not meet the standard of authenticity, and the narrators did not even feel the need to look at the chain of transmission, even though these hadiths The narrator is trustworthy and his isnads are connected. This is the reason why they present a few sayings and signs attributed to Imam Muhadditheen in order to reconcile their self-made quality of authority with that of the Imams, whose purpose is to convince them of the mutual contradiction of the hadiths and in the face of this contradiction. The Nazar-e-Zhokah considers the hadiths to be doubtful. Even if these traditions are of a very high level in terms of evidence. Therefore, they reject some of the most accurate traditions of the books of hadiths by presenting the words of Imam Muhammad Sain, may God have mercy on him, in a non-religious manner.

One of the great virtues of Ahl al-Darayat is that they see every hadith clashing with another hadith or some verse of the Holy Quran. While the fact is that in the correct traditions, this kind of conflict is impossible in reality. The efforts made by Muhdsain Karamullah to resolve the conflict of conflicting traditions are worthy of being counted as the benefactors of the entire Ummah. If two Shariah arguments conflict with each other, then the imam's first attempt is to reconcile them, however, those imams who are unable to reconcile, then they would declare one tradition as Rajh and implement at least one tradition. There are, but on the contrary, if the conflict of the same tradition is resolved by other imams, then the adaptation and pluralism described by them will still have the priority stated by the first imam either over the qif, because the principle is that pluralism is abrogated. , is always preceded by preference and pause.

منکرین حدیث چند ایسی احادیث بھی نقل کرتے ہیں، جنہیں ان کے زعم میں درایتی معیار پر پورا نہ اترنے کی بناپر محدثین کرام نے نا قابل قبول قرار دے دیا ہے اور راویان سند کو دیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی، حالانکہ ان احادیث کے راوی ثقہ اور ان کی اسانید متصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ درایتی معیار کی سند کو آئمہ محدثین کے ساتھ ملانے کے لیے ان کی طرف منسوب چند اقوال و آثار کو پیش کرتے ہیں، جن سے ان کا مقصود روایات کے باہمی تعارض کو باور کروانا اور اس تعارض کے پیش نظر ذخیرہ احادیث کو مشکوک قرار دیتا ہے۔ خواہ یہ روایات پایہ ثبوت کے اعتبار سے نہایت اعلی درجہ ہی کی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وہ بعض آئمہ محدثین رحمۃ اللہ کے کلام کو غیر محل میں پیش کر کے کتب احادیث کی چند صحیح ترین روایات کا انکار کر دیتے ہیں کہ محدثین کرام جن نے ان روایات کو اصول درایت کے خلاف ہونے کی وجہ سے رد کیا ہے۔

اہل درایت، کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کو ہر حدیث دوسری حدیث یا قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت سے ٹکراتی نظر آتی ہے۔ جبکہ امر واقع یہ ہے کہ صحیح روایات میں اس قسم کے تعارض کا حقیقت میں ہونا ہی محال ہے۔ متعارض روایات کے تعارض کو حل کرنے کے لیے محدثین کرام اللہ نے جس قدر کوششوں سے کام لیا ہے وہ اس پر پوری امت کے محسن شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ اگر دو شرعی دلیلوں کا آپس میں تعارض ہو جائے تو آئمہ کی پہلی کوشش ان کی باہمی تطبیق و توفیق کی ہوتی ہے، البتہ جو آئمہ جمع تطبیق سے قاصر رہتے ہیں تو وہ ایک روایت کو راجح قرار دے کر کم از کم ایک روایت پر عمل بجالاتے ہیں، لیکن اس کے بالمقابل اگر اسی روایت کے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

تعارض کو دوسرے آئمہ حل کر دیں تو ان کی بیان کردہ موافقت اور جمع کو بہر حال پہلے آئمہ کی بیان کردہ ترجیح یا توقیف پر تقدم حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اصول یہی ہے کہ جمع نسخ، ترجیح اور توقف سے بہر حال مقدم ہوا کرتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت میں پائی جانے والی دو نصوص کا جو تعارض بظاہر ہمیں دیکھائی دیتا ہے، اس قسم کا تعارض تو قرآن کریم کی دو آیات کے مابین بھی نظر آتا ہے۔ اس نادر موضوع پر علامہ محمد امین شنقیطی رحمۃ اللہ (م ۱۳۹۳ھ) صاحب تفسیر أضواء البیان نے دفع إیهام الاضطراب کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھ کر تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ اگر صحیح متعارض نصوص کو حل کرنے کے لیے درایتی معیارات ہی تحقیق کا مناسب اسلوب ہیں تو قرآن مجید میں بھی اصولی طور پر اس رویہ کو ملحوظ رکھنا پڑے گا، جو توہین کے مترادف ہے۔ اس لیے آج کل جو لوگ تحقیق سند سے قطع نظر متن کی تحقیق کے لیے اصول درایت پیش کر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر روایت کی تحقیق کا یہ اصول مسلمہ ہے تو قرآن کریم بھی چونکہ روایت ہی سے ہم تک پہنچا ہے، اس لیے اصول درایت کے مسلمہ ہونے کا لازمہ یہ ہو گا کہ روایت قرآن کا درایتی نقد بھی کیا جائے۔

الغرض وہ تمام اصول درایت جنہیں پیش کر کے سنت کی مرویات کو چھوڑنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے، قرآن مجید کی مروایات میں بھی ہو بہو اسی قسم کی تمام کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس فرق کو کیوں روا رکھا جاتا ہے کہ حدیث کے لیے تو اصول درایت ہوں جبکہ قرآن کے لیے کوئی اصول درایت نہ ہوں۔ مثلا احادیث قرآن سے ٹکراتی ہیں یا اکثر احادیث باہم متعارض ہیں یا ان میں مسلمہ تاریخی حقائق کے خلاف باتیں پائی جاتی ہیں یا ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صحابہ کرام کے بارے میں غیر مناسب باتیں ملتی ہیں وغیرہ جیسے تمام اعتراضات بعینہ قرآن پر بھی عائد ہوتے ہیں کیونکہ قرآن کی آیات میں بھی اس قسم بعینہ کی اشیا موجود ہیں۔

ذیل میں ہم اہل درایت کی جانب سے پیش کردہ چند ایسی احادیث نقل کر رہے ہیں جنہیں ان کے زعم میں درایتی معیار پر پورا نہ اترنے کی بنا پر محدثین کرام رحمۃ اللہ نے ناقابل قبول قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے راوی ثقہ اور ان کی اسانید متصل ہیں۔ ان احادیث پر آئمہ محدثین کی طرف پیش کردہ اعتراض کو ذکر کرنے کے بعد ہم اعتراض کی حقیقت واضح کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کیا ان اقوال محدثین سے نقد روایت کے درایتی تصور کو ثابت کیا جانا ممکن بھی ہے یا نہیں !

- صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عباس اور حضرت علی علی ایک جھگڑے کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

اقض بيني و بين هذا الكاذب الائم الغادر الخائن [1]

میرے اور اس چھوٹے گناہگار بد عید اور خائن کے درمیان فیصلہ کر دیجئے۔

اعتراض

امام نووی رحمۃ اللہ (م ۵۶۷۶) ، علامہ مارزی رحمۃ اللہ (م ۵۵۳۶) سے نقل کرتے ہیں:

هذا الألفاظ الذي وقع لا يليق ظاهره بالعباس وحاش لعلى أن يكون فيه بعض هذه الأوصاف، فضلا عن كلها، ولسنا نقطع بالعصمة إلا للنبي ولمن شهد له بها، لكنا مأمورون بحسن الظن بالصحابة رضى الله عنهم أجمعين ونفى كل رذيلة عنه، وإذا انسدت طرق تأويلها نسبنا الكذب إلى رواتها " [2]

اس روایت میں واقع یہ الفاظ بظاہر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے صادر نہیں ہو سکتے اور نا ممکن ہے کہ سید علی رضی اللہ عنہ کی ذات ان میں سے کوئی ایک وصف بھی ہو اور ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان لوگوں کے علاوہ جن کے بارے میں آپ نے شہادت دی ہے، کسی کے بارے میں معصوم ہونے کا عقیدہ نہیں ہے

[1] امام، مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح مسلم، (2009)، فرید بک سٹال اردو بازار، لاہور، ص 257

[2] شرح مسلم النووی: ۱۲/۷۴

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ہمیں حکم ہے کہ صحابہ کے بارے میں حسن ظن رکھیں اور ہر بری بات کی ان سے نفی کریں، جب تاویل کے تمام راستے بند ہو جائیں تو پھر ہم جھوٹ کی نسبت روایت کے راویوں کی طرف کریں گے۔"

جواب

علامہ مادری(م۵۳۶) کے موقف کی توضیح

علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) کے بارے میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کے بعض راوی وہم کا شکار ہو گئے ہیں اور دوسرا دعوی یہ ہے کہ حضرت عباس سے اس طرح کے سخت کلمات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف زبان سے صادر ہونا محال ہیں کیونکہ یہ ان کے مقام صحابیت کے منافی ہیں۔ذیل میں ہم علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) کی جانب منسوب کیے جانے والے دونوں کا جائزہ پیش کر رہے ہیں:

مقام صحابیت کا مسئلہ

حضرات صحابہ کرام کا مقام نہایت ارفع اور اعلی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم عام مسلمانوں کو یہ بات قطعا زیب نہیں دیتی کہ ہم ان کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمات ادا کریں، کیونکہ اس روش سے ہمارے ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور ہمیں یہی حکم ہے کہ ان کے بارے میں جہاں تک ممکن ہو سکے حسن ظن کا مظاہرہ کریں۔ مشاجرات صحابہ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا معتدل اور راجح موقف یہی ہے کہ ہم ان کے بارے میں اپنی زبانوں کو بند رکھیں۔ تفصیل کے لیے مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کی کتاب بنام مشاجرات صحابہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ لیکن اصحاب رسول کا آپس میں معاملہ ایک بالکل دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ آپس میں خرید و فروخت کرتے تھے اور ان سے بطور بشریت عام انسانوں کی طرح گناہ بھی صادر ہوئے تو جن روایات میں بعض صحابہ کرام کو شراب پینے یا زنا کے جرم کا ارتکاب کرنے پر حد جاری کرنے کا ذکر ہے تو کیا ان تمام روایات کو شان صحابہ کے منافی قرار دے کر رد کر دیا جائے گا؟ نیز صحابہ کے مابین جنگیں ہوئی ہیں کیا ان تمام روایات کو جو اس ضمن میں وارد ہیں رد کر دینا چاہیے کہ ان شرف صحابہ پر زد پڑتی ہے؟ اس قسم کی بات کوئی ہوش مند نہیں کہہ سکتا۔ جب اتنے بڑے واقعات کا حضرات صحابہ کرام سے ظہور ممکن ہے تو حضرت عباس اور حضرت علی علی کی مثال اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی جبکہ ان دونوں کا باہمی تعلق چچا اور بھتیجے کا بھی ہو۔

وہم راوی کا مسئلہ

باقی رہا علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶) کا اس حدیث کے راویوں کو وہمی کہنا تو وہ خود اس فیصلے میں متردد ہیں، بلکہ ان الفاظ کو صحت ثبوت پر محمول کرتے ہوئے اس کی دوسری صورت کو راجح قرار دے رہے ہیں۔

علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) کی اصل عبارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن الفاظ کو ان کے حوالے سے اوپر نقل کیا گیا ہے وہ ان الفاظ کی تاویل میں متردد ہیں اور مذکورہ رائے کو انہوں نے حتماذکر نہیں کیا بلکہ اس کے علاوہ دوسری رائے کو وہ عمدہ اور اجود کہہ رہے ہیں، جسے انہوں نے ان الفاظ کی صحت ثبوت کے پیش نظر اختیار کیا ہے۔ علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) مذکورہ عبارت کے بعد خود ہی

فرماتے ہیں:

واذا كان هذا اللفظ لا بد من إثباته ولم نضف الوهم إلى رواته فأجود ما حمل عليه أنه صدر من العباس على جهة الإدلال على ابن أخيه لانه بمنزلة ابنه وقال مالا يعتقده وما يعلم براءة ذمة ابن أخيه منه ولعله قصد بذلك ردعه عما يعتقد أنه مخطى فيه [3]

جبکہ حضرت عباس کے حضرت علی سے متعلق کہے ہوئے یہ الفاظ حتمی طور پر صحیح ثابت ہیں اور راویوں کا وہم بھی نہیں تو بہترین جواب جس پر ان الفاظ کو معمول کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ یہ الفاظ حضرت عباس سے اپنے بھتیجے علی بن ابی طالب کی راہ پر ناز کے طور پر صادر ہوئے ہیں، کیونکہ حضرت علی ان کے بیٹوں کی طرح ہی تھے اور باپ

[3] شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۲/۷۲

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

اپنے بیٹے کو ایسے الفاظ سے خطاب کر لیتا ہے اور انہوں نے حضرت علی کو ایسے لفظوں سے یاد کیا جن کے دل سے وہ معتقد نہیں تھے اور وہ جانتے تھے کہ علی اس سے بری الذمہ ہیں، چونکہ وہ اس جھگڑے میں حضرت علی کو غلطی پر سمجھتے تھے، شاید ان الفاظ کے استعمال سے ان کا مقصد حضرت علی کو اپنی غلطی سے روکنا ہو۔

یہ مختصر الفاظ جنہیں درایت کے خلاف سمجھ کر رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے دراصل ایک لمبی حدیث میں وارد ہوئے ہیں جسے مفصل ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔

اس قسم کی امثلہ کتب حدیث میں اور بھی ہیں، مثلا حضرت عمر اپنے بیٹے عبد اللہ بن عمرو کے خلاف کئی دفعہ مقدمہ لے کر نبی کریم کی عدالت میں تشریف لے کر گئے ہیں اور یہ بات بالکل عادی بات ہے کہ جب باپ یا چچا جیسے رشتہ دار اپنے نفس کو قابو میں کر کے شریعت کا حکم مانتے ہوئے اپنے بیٹوں کے بالمقابل ایک فریق بن کر عدالت پہنچ جائیں تو قلبی رنج عام حالات سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ بہر حال باپ یا چچا بیٹے یا بھتیجے کے برابر نہیں۔ صحابہ کرام سے گناہ بھی ہوئے اور وہ عادل ہی ہیں، معصوم تو نہیں کیونکہ وہ بھی بالآخر ہماری طرح انسان ہی تھے اس لیے اس قسم کے اقوال کا انسانوں سے صادر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خلاصہ کلام

ہماری مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) رواۃ حدیث کو وہمی قرار دینے میں خود متذبذب ہیں۔ علمی دنیا کی یہ عجیب روایت ہے کہ کسی مصنف کی تردد پر مبنی عبارت سے اپنے خود تراشیدہ اصولوں کا جواز ثابت کیا جارہا ہے۔ یہ معاملہ اس وقت مزید گھمبیر ہو جاتا ہے جب خود مصنف کتاب اپنے ذو معنی کلام کی کسی دوسرے مقام پر صراحت کرتے ہوئے کسی ایک جانب اپنا رجحان ظاہر کر دے۔ اس صورت میں تو مصنف کی آخری اور حتمی رائے کو مانے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا، کجا یہ کہ اس کے ذو معنی موقف کو ذکر کر کے اپنے اصول ہائے جدیدہ کی آبیاری کے لیے استعمال کیا جائے۔ علاوہ ازیں ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ یہ چند الفاظ اگر راویوں کا وہم قرار پائیں گے تو باقی طویل حدیث کو آپ کہاں لے جائیں گے؟ وہ بھی انہی راویوں کی روایت کردہ ہے، جنہیں آپ کی درایت وہمی کہتی ہے اور اگر وہ باقی حدیث کے قبول کرنے میں ثقہ اور معتبر ہیں تو ان سے مروی ان الفاظ کا بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے، جو حضرت علی سے متعلق کیے گئے ہیں۔ نیز لڑائی جھگڑے میں اس قسم کے سخت الفاظ کا صادر ہونا درایت کے اعتبار سے محال نہیں ہے، خاص کر جبکہ باپ یا اس کے قائم مقام چچا اپنے بیٹے یا بھتیجے سے متعلق ایسے نوکیلے لفظ بولے تو اس میں کسی درایتی معیار کی مخالفت نہیں پائی جاتی۔

المختصر علامہ مازری رحمتہ اللہ (م ۵۳۶ھ) کی تردد پر مبنی عبارت سے اصول اخذ کرنا یا اسے اپنی حمایت کے لئے پیش کرنا ہر گز معقول نہیں ہے۔

- صحیح بخاری میں روایت ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم اپنے والد کو دیکھیں گے کہ ان پر ذلت اور سیاہی چھائی ہوئی ہے، تو اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ یا اللہ! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمہیں رسوا نہیں کروں گا۔ اللہ تعالی ارشاد فرمائیں گے کہ میں نے جنت کو کافروں پر حرام کر رکھا ہے۔

اعتراض

مذکورہ روایت پر امام اسماعیلی رحمتہ اللہ (م ۲۹۵ھ) اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هذا خير في صحته نظر من جهة أن إبراهيم علم أن الله لا يخلف الميعاد، فكيف يجعل ما صار لأبيه خزيا مع علمه بذلك [4]

اس روایت کی صحت میں اشکال ہے کیونکہ ابراہیم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا تو ان کے والد کا جو انجام ہوا ہوا اس کو وہ کیسے اپنی رسوائی قرار دے سکتے ہیں۔

جواب

[4] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج 8، ص 500

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ہماری معاشرتی سطح پر کسی موضوع سے متعلقہ مختلف اور متعارض اقوال کو پرکھنے کا عام ضابطہ یہ ہے کہ اقوال کے صحت وضعف کا مدار ان کے قائلین کا علمی و سماجی مرتبہ قرار پاتا ہے اور جو شخص جس قدر سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اس قدر معاشرتی معاملات میں اس کی بات کو ترجیح دی جائے گی۔ ترجیح اقوال کے سلسلہ میں بالکل یہی اصول علمی دنیا میں بھی کارفرما ہے اور ایک ہی میدان کار سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم کو کسی قول یا موقف کی ترجیح میں ان کے علمی تفوق کو کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور یہ اہمیت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے کہ جب مختلف موقف کے قائلین کا میدان کار بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہو۔ اس وقت ظاہر بات ہے کہ متعلقہ میدان سے تعلق رکھنے والے صاحب علم کو فوقیت دی جائے گی۔

یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف صحیح بخاری کی حدیث ہے، جسے تلقی بالقبول حاصل ہے اور اس حدیث کے بیان کرنے والے رواۃ ثقہ اور قابل اعتبار ہیں اور دوسری طرف امام اسماعیلی رحمۃ اللہ (م ۲۹۵ھ) ہیں جو اس کی صحت میں اشکال کا شکار ہیں، تو بلا دلیل اسماعیلی رحمۃ اللہ (م ۲۹۵ھ) کے اشکال کو قبول کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں جس کی بنا پر صحیح بخاری کی حدیث کو نظر انداز کیا جا سکے۔

تعارض اور اس کا حل

عام منکرین حدیث چونکہ دو عبارتوں میں تعارض کی صورت میں جمع کے بجائے ترجیح کے قائل ہیں، اس لئے ان کی یہ مجبوری ہے کہ وہ ایک نص کو چھوڑنے کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ ایسے مقام میں جمع و تطبیق مقدم ہے اور وہ یہاں بھی ممکن ہے۔ حضرت ابراہیم جانتے ہیں کہ اللہ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتے لیکن انبیاء معصوم تو ہوتے ہیں مگر ان کے معصوم ہونے سے کہاں لازم آتا ہے کہ وہ انسانوں کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی حدیث کے ضعف کی بنیاد اسی طرح کی اشیاء بنتی ہیں تو قرآن کریم کی کتنی آیات میں خود رسول اللہ ﷺ سے بھی بشری طور پر اس قسم کی اقوال وافعال اور پھر اللہ کی جوابا تعصیبہ کا ذکر ہے جو اللہ کی نظر میں انبیاء کے مقام کے مناسب نہیں۔ حضرت ابراہیم جانتے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتے لیکن باپ، بیٹے کا رشتہ بھی نازک ہے، چنانچہ روز قیامت باپ کو عذاب میں دیکھ کر صبر نہ کر پائیں گے اور اللہ تعالی سے رحم کی اپیل کریں گے۔ روایات میں صراحت موجود ہے کہ ان کی گذارش پر اللہ تعالی ان کے باپ کی صورت مسخ کر کے ایک جانور بنا دیں گے تو حضرت ابراہیم بھی اپنی رسوائی کی بات سے بری ہو جائیں گے۔[5]

- صحیح بخاری کی روایت کے مطابق عمرو بن میمون رحمۃ اللہ (م ۷۴ھ) کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا اس پر دوسرے بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا۔

اعتراض

حافظ ابن عبدالبر: (م ۴۶۳ھ) اس حدیث پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فيها إضافة الزنا إلى غير مكلف وإقامة الحد على البهائم وهذا منكر عند أهل العلم . قال فإن كانت الطريق صحيحة فلعل هولاء كانوا من الجن لأنهم من جملة المكلفين ۔[6]

"اس میں زنا کی نبوت غیر مکلف کی طرف کی گئی ہے اور جانوروں پر حد لگانے کا ذکر ہے، اہل علم کے نزدیک یہ بات بعید از قیاس ہے۔ اگر اس روایت کی سند صحیح ہے تو پھر غالبا یہ جن ہوں گے کیونکہ وہ بھی مکلفین میں شامل ہیں۔"

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں:

"محدث ابن الجوزی رحمۃ اللہ (م ۵۹۷ھ) نے بھی اس بنیاد پر اس روایت کو رد کیا ہے۔"

جواب

---

[5] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص500

[6] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص500

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

احادیث نبویہ پر اعتراض کرنے والے بھی عجیب ذوق کے مالک ہوتے ہیں، جہاں انہیں کسی عالم کا قول حدیث نبوی کے خلاف مل جائے تو اسے حجت بنا کر حدیث کی تردید میں پیش کر دیتے ہیں اور اگر اسی عالم کا قول کسی روایت کی تائید میں ثابت ہو تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔اس سے قبل حدیث ابراہیم علیہ السلام کے خلاف امام اسماعیلی رحمۃ اللہ (م ۲۹۵ھ) کے قول کو انہوں نے پیش کر کے انکار حدیث کی دلیل بنالیا، لیکن اسی عمرو بن میمون رحمۃ اللہ (م ۷۴ھ) کے واقعہ کو حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے امام اسماعیلی بلانے (م ۲۹۵ھ) سے نقل کیا ہے اور انہوں نے اس واقعہ کی تائید کرتے ہوئے اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[7] لیکن یہاں امام اسماعیلی رحمۃ اللہ (م ۲۹۵ھ) کی تائید کو قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

حقیقت حال

بندروں کے رجم کرنے کا واقعہ نہ تو کوئی مرفوع حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہو اور نہ ہی کسی صحابہ کا قول ہے، بلکہ عمرو بن میمون رحمۃ اللہ (م ۷۴ھ) کا چشم دید واقعہ ہے جو کہ کوفہ کے رہنے والے اور تابعی ہیں۔ نیز امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ: (م ۴۶۳ھ) کی طرف سے پیش کردہ اعتراض حدیث پر اعتراض کے بجائے ایک تابعی کے مشاہدے پر اعتراض ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اشکال کا حل

- امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ (م ۴۶۳ھ) کی طرف سے اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسری تاویل بھی ذکر کی گئی ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) نے ذکر کیا ہے۔ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

فإن كانت الطريق صحيحة فلعل هؤلاء كانوا من الجن لانهم من جملة المكلفين[8]

اس واقعہ کی سند صحیح ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ (بندروں کی صورت میں) وہ جن ہوں کیونکہ وہ بھی ہماری طرح مکلف ہیں۔

- حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) نے ابن عبد البر رحمۃ اللہ (م ۴۶۳ھ) کی پیش کردہ توجیہ سے اتفاق کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ ایسا واقعہ بندروں سے بھی صادر ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اپنی عادتوں میں انسان کے بہت مشابہ ہیں۔دوسرے حیوانوں کی بہ نسبت ان میں سمجھ بوجھ زیادہ پائی جاتی ہے۔ جو ہنر چاہیں آپ انہیں سکھا سکتے ہیں اور جو کچھ یہ دیکھتے ہیں اس کی نقل اتار لیتے ہیں۔انسان کی طرح یہ بنتے اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔انسانوں کی مثل ان کے ہاتھ، انگلیاں، ناخن اور پورے ہیں۔اپنے ہاتھ سے چیزیں پکڑتے اور ہاتھوں سے ہی کھاتے ہیں۔دو پاؤں پر چل سکتے ہیں اور ان کا اپنے بچوں کے اٹھانے کا طریقہ بھی انسانوں سے ملتا جلتا ہے۔دوسرے حیوانات سے کہیں بڑھ کر ان میں غیرت پائی جاتی ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ بحث یہ ہے کہ صحیح بخاری میں بیان کردہ عمرو بن مامون رحمۃ اللہ (م ۷۴ھ) کی حدیث خود ان کا چشم دید واقعہ ہے، کوئی مرفوع حدیث رسول نہیں، جس پر تعجب کا اظہار کیا جا سکے کہ بندر تو ایک غیر مکلف مخلوق ہیں اور ان میں زنا اور جرم کا سوال پیدا کرنا ہی فضول کی بات ہے؟ ہم عرض کریں گے کہ جنات نے بندروں کی شکل اختیار کر لی تھی اور جنات انسانوں کی مانند شرعی احکام کے مکلف ہیں، یا ممکن ہے کہ انسانی صفات سے مشابہت کی بنا پر بندروں کی جنس میں بھی غیرت کا مادہ اس قدر تسکین ہو کہ مکلف نہ ہونے کے باوجود بندر نے اپنی بندریا کے دوسرے کے ساتھ جنتی ہونے کی وجہ سے شور مچا دیا ہو اور سب بندروں نے مل کر پتھر مار مار کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔اگرچہ بندروں کی مخلوق رجیم یا زنا کے مفہوم سے ناآشنا ہے، لیکن اسے زنا یا رجیم کے الفاظ سے ذکر کرنا تو دیکھنے والے راوی کی تعبیر ہے۔

- صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن ابی کے حامیوں اور آنحضرت ﷺ کے صحابہ کے مابین جھگڑا ہو گیا، جس پر یہ آیت اتری:

---

[7] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج7، ص190

[8] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج7، ص190

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا

اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کروادیا کرو۔

اعتراض

محدث ابن بطال رحمۃ اللہ (م ۴۴۹ھ) فرماتے ہیں:

یہ آیت اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں دو مومن گروہوں میں صلح کرانے کا ذکر ہے، جبکہ روایات کے مطابق عبد اللہ بن ابی اور اس کا گروہ اس وقت تک علانیہ کافر تھا۔

جواب

اہل درایت کا عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی محدث کسی روایت پر کسی دوسرے محدث کے قول کو بطور اشکال پیش کرتا ہے تو یہ لوگ اس شاذ قول کو اٹھا لیتے ہیں اور جواب گول کر جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (۸۵۲۳ھ) نے امام ابن ابطال رحمۃ اللہ (م ۴۴۹ھ) کے مذکورہ موقف کو نقل کرنے کے متصلاً بعد خود وضاحت فرمائی ہے:

قلت يمكن ان يحمل على التغليب "

ہو سکتا ہے مومنین کو مشرکین پر غلبہ دیتے ہوئے دونوں جماعتوں کو من المؤمنین سے تعبیر کر دیا ہو، جیسے شمس و قمر کو تغلیبا قمران" کہہ دیا جاتا ہے۔

آیت کریمہ کا شان نزول

زیر بحث مسئلہ علم حدیث سے کہیں بڑھ کر علم تفسیر سے تعلق رکھتا ہے، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے مفسرین عظام کی طرف رجوع کریں کہ انہوں نے اس آیت کے شان کے بارے میں کیا کہا ہے؟ کیونکہ کسی بھی آیت کے شان نزول اور پس منظر سے درپردہ حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور اشکال کی تمام صورتیں زائل ہو جاتی ہیں۔

- سورہ حجرات کی مذکورہ آیت کا پس منظر ذکر کرتے ہوئے علامہ نسفی رحمۃ اللہ (م ۵۳۷ھ) فرماتے ہیں:

ومضى رسول الله وطال الخوض بينهما حتى استبا و تجالدا وجاء قوما هما وهما الأوس والخزرج فتجالدوا بالعصى وقيل بالأيدى والنعال والسعف فرجع إليهم رسول الله فاصلح بينهم و نزلت " [9]

نبی اکرم تو وہاں سے چلے گئے اور ان دونوں کا جھگڑا طول پکڑ گیا، دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا اور مار کٹائی کی، نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ دونوں قومیں۔ اوس اور خزرج بھی آن پہنچے جن کے درمیان لاٹھیوں سے اور بعض کے بقول، ہاتھوں، جوتوں اور کھجور کی چھڑیوں سے لڑائی ہوئی، نبی اکرم ﷺ نے واپس آکر ان کی صلح کرائی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

- امام ابو سعود رحمۃ اللہ (م ۹۸۲ھ) نے اپنی تفسیر میں مذکورہ آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

والآية نزلت في قتال حدث بين الأوس والخزرج في عهده عليه الصلوة والسلام "[10]

یہ آیت اس لڑائی سے متعلق نازل ہوئی ہے جو نبی علیہ السلام کی زندگی میں اوس و خزرج دو قبیلوں کے درمیان پھوٹ پڑی تھی۔"

- امام قرطبیؒ رحمۃ اللہ (م ۶۷۱) آیت مذکورہ کا پس منظر یوں ذکر فرماتے ہیں:

قال مجاهد نزلت في الأوس والخزرج، قال مجاهد تقاتل حيان في الانصار بالعصى والتعال فنزلت الآية و مثله عن سعيد بن جبير أن الأوس والخزرج كان بينهم على عهد رسول الله قتال بالسعف والنعال و نحوه فأنزل الله هذه الآية فيهم .[11]

---

[9] النسفی، ابوالبرکات عبداللہ بن أحمد بن محمود تفسیر النسفي، دار احیاء الکتب العربیۃ، حلب: ۵/۲۸

[10] تفسیر أبي سعود: ۸/۱۳۰

مجاہد نے نے کہا ہے کہ انصار کے دو قبائل۔اوس اور خزرج کے درمیان لاٹھیوں اور جوتوں سے لڑائی ہو گئی تھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی، ایسے ہی سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اوس اور خزرج کے درمیان جوتوں اور کھجور کی شاخوں وغیرہ کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اس آیت کو اللہ تعالیٰ نے انہی کے بارے میں نازل فرمایا۔

کتب تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے اختصار کی وجہ سے امام ابن ابطال رحمتہ اللہ (م ۴۴۹) کو غلطی لگی ہے کیونکہ اول امر میں یہ جھگڑا اگرچہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان واقع ہوا تھا، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے یہ مترشح ہوتا ہے، لیکن آخر کار یہ تنازع وسیع ہوتا گیا حتی کہ مسلمانوں کے دو قبائل اوس اور خزرج بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔

ایک اہم سوال

مندرجہ بالا تفسیری روایات سے ہمیں یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت کریمہ (وان طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بینہما)دو مسلمان اور مؤمن خاندانوں، اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئی تھی، لیکن یہاں ممکن ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ صحیح بخاری میں بیان کی جانے والی روایت کا تقاضا ہے کہ اس آیت کا شان نزول حامیان عبد اللہ بن ابی اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین ہونے والا جھگڑا تھا۔اب حدیث بخاری اور تفسیری روایات میں تعارض ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے درمیان راہ تطبیق کیا ہے اور یہ بھی کہ عبد اللہ بن ابی تو ابھی اعلانیہ کافر تھا اس کو مسلمان کہنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ یعنی اگر شان نزول اوس اور خزرج کا جھگڑا ہے تو عبد اللہ بن ابی والی روایت کا کیا معنی ہے؟ اور اگر شان نزول کا تعلق عبد اللہ بن ابی کے ساتھ ہے تو اس کو مومن کہنا کیا معنی رکھتا ہے، حالانکہ نزول آیت کے وقت وہ صریحا کافر تھا؟

جواب

انصار کے ان دونوں قبائل کے درمیان یہ عداوتیں اور لڑائیاں زمانہ جاہلیت سے مسلسل چلی آرہی تھیں اور ان کے اسلام قبول کرنے کے باوجود آغاز ہجرت تک اس کا اثر ان میں باقی تھا، لیکن اس کے بعد رسول اکرم کی تعلیم و تربیت سے ایسی قباحتوں کی بیخ کنی ہو گئی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے تھے۔مگر اس سے قبل چونکہ ان میں جاہلیت کی عداوتیں اور کدورتیں باقی تھیں جن کی بناء پر بعض دفعہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی تھی، جیسا کہ اس پر بھی جھگڑا مسلمان اور غیر مسلم سے تجاوز کر کے اوس اور خزرج دو قبائل تک پھیل گیا تھا کیونکہ عبد اللہ بن ابی کا تعلق اوس و خزرج میں سے جس قبیلہ سے تھا اس قبیلہ کے لوگ خاندانی عصبیت کی بنیاد پر دوسرے قبیلہ کے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے مدمقابل آکھڑے ہوئے اور یوں یہ لڑائی مسلمان قبائل میں بھڑک اٹھی، جن کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیتے مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حدیث بخار حدیث بخاری اور تفسیری روایات ایک ہی وقت میں قابل عمل نہیں ہیں کیونکہ دونوں کا محل اور مراد مختلف ہے۔حدیث بخاری دراصل اس تنازع کی ابتدائی صورت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس میں جھگڑے کے فریقین مسلمان اور غیر مسلمان سب تھے، لہذا آیت کے شان نزول میں بیان کی جانے والی جمیع تفسیری روایات اپنے محل میں بالکل واضح ہیں، لیکن ان تفسیری روایات کا مصداق مؤمنین کی جماعتیں ہیں، عبد اللہ بن ابی کے حاملین نہیں، کیونکہ عبد اللہ بن ابی تو اس وقت صریحا کافر تھا اور اصل جھگڑا دو مسلمان فریقوں میں ہوا تھا، جن کے مابین صلح کروانے کا اللہ تعالی نے حکم دیا۔اب یہ سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ عبد اللہ بن ابی کو کافر کی بجائے مومن کہنے کی کیا وجہ ہے، کیونکہ جب نزاع اور صلح کا تعلق ہی عبد اللہ بن ابی سے نہیں ہے تو اس کو آیت میں مذکور لفظ مومن کا مصداق کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

ایک اور اشکال اور اس کا جواب

حافظ ابن حجر رحمۃاللہ: (م ۸۵۲ھ) نے یہاں ایک دوسرا اشکال یہ اٹھایا ہے کہ جھگڑے کا یہ واقعہ جنگ بدر سے پہلے آغاز ہجرت کا ہے، جس کے بارے میں آیت: ﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقتتلوا ﴾نازل ہوئی ہے اور یہ آیت جس سورت (حجرات) میں واقع ہے وہ سورت بہت بعد میں نازل ہوئی ہے۔اس کا جواب ابن حجر رحمۃاللہ (م ۸۵۲ھ) ہی کی طرف سے یہ ہے کہ ممکن ہے یہ آیت متقدم النزول ہو اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اسے سورہ

[11] القرطبی، محمد بن احمد الانصاري تفسیر القرطبی الجامع لاحکام القرآن، مکتبہ الغزالي: ۸/۳۱۵

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

حجرات میں رکھا گیا ہو جو متاخر النزول ہے اور یہ تنجیم القرآن کا تقاضا بھی ہے کیونکہ آپ ﷺ پر جب کوئی آیت نازل ہوا کرتی تھی تو آپ کاتب وحی سے فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت کے فلاں مقام میں درج کر دو۔

- سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کرتے ہوئے اپنے اعضاء کو تین تین مرتبہ دھویا اور پھر فرمایا:

من زاد على هذا أو نقص فقداً ساء وظلم

جس نے اس میں کمی وبیشی کی اس نے برا کیا اور ظلم کیا۔

اعتراض

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

إسناده جيد لكن عده مسلم في جملة ما أنكر على عمرو بن شعيب لأن ظاهره ذم النقص من الثلاث [12]

اس کی سند عمدہ ہے لیکن امام مسلم نے اس کو عمرو بن شعیب کے منکرات میں شمار کیا ہے کیونکہ ظاہر کے لحاظ سے یہ روایت تین مرتبہ سے کم دھونے والے کی مذمت کرتی ہے، حالانکہ صحیح روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت ہے۔"

جواب

جس مقام پر ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) نے یہ اشکال پیش کیا ہے، اسی جگہ خود ان مختلف صحیح روایات میں موافقت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

روایت کے الفاظ دیکھیں تو وہاں من زاد علی ھذا أو نقص کے الفاظ موجود ہیں۔ اس لیے نقص سے مراد تین مرتبہ دھونے کی تعداد میں کمی کرنا مراد نہیں بلکہ ایک مرتبہ وضو کے اعضاء دھونے میں نقص اور کوتاہی کرنا مراد ہے۔ بایں طور کہ وضو کے اعضاء کو ایک بار دھوتے ہوئے مکمل نہ دھویا جائے بلکہ ان کے بعض حصوں میں خشک جنہیں باقی ہوں جو دھونے سے رہ جائیں، جیسا کہ خود جناب رسول اللہ نے ایک موقع پر دیکھا کہ وضو کرنے والوں کی ایڑھیوں میں خشک جگہیں پائی جاتی ہیں جو دھونے سے رہ گئی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ویل للأعقاب من النار، المختصر سنن ابو داؤد کی روایت میں وارد شدہ نقص کے لفظ سے یہی مراد ہے۔[13] لیکن اگر نقص کے الفاظ سے مراد تین واقعہ سے کم دھونے کا نقص مراد لیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پھر یہ راوی کا ایسا وہم ہے جو ایسا اوقات انسان ہونے کے ناطے ہونا ممکن ہے۔ جیسا کہ سیوطی رحمۃ اللہ (م ۹۱۱ھ) نے ابن المواق "(م ۸۹۷ھ) سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔[14]

اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) کے علاوہ بعض دیگر محدثین نے ایک اور جواب اس اشکال کا دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سنن ابی داؤد کی حدیث مذکور راوی کے وہم پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ (م ۹۱۱ھ) نے اپنے حسب ذیل الفاظ کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے:

قال السيوطي قال ابن المواق إن لم يكن اللفظ شكا من الراوى فهو من الأوهام البيئة التي لاخفاء لها اذا الوضوء مرة ومرتين لا خلاف في جوازه والآثار بذلك صحيحة والوهم فيه من أبي عوانة "[15]

امام سیوطی رحمۃ اللہ (م ۹۱۱ھ) نے ابن المواق (م ۸۹۷ھ) سے نقل کیا ہے کہ یہ نقص، کا لفظ اگر راوی کا شک نہیں تو اس کا وہم ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ ایک یا دو دفعہ اعضاء وضوء کا دھونا جائز ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں اور صحیح احادیث اس بارہ میں ثابت ہیں اور یہ لفظ ابو عوانہ کا وہم ہے، جو اس حدیث کے رواۃ میں سے ہے۔

فائدہ

---

[12] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج 1، ص 233

[13] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج 1، ص 233

[14] عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: ۵۲۱

[15] عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: ۵۲۱

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

امام سیوطی رحمۃ اللہ (م ۹۱۱ھ) نے نقص کے لفظ کو راوی حدیث ابو عوانہ (م ۱۷۶ھ) کا وہم قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کو درایت کے نام پر ہر گز رد نہیں کیا گیا۔ ہمارا تو کہنا ہی یہ ہے کہ محدثین کرام نے فن حدیث میں مقرر کردہ اصول حدیث کو سند تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے شاذ اور علت کی ایسی شرائط بھی عائد کر دی ہیں، جن کا تعلق تحقیق متن کے ساتھ ہوتا ہے۔

- صحیح بخاری میں واقعہ معراج کی ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہوا۔

اعتراض

امام ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶) اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اہل علم کا اتفاق ہے کہ واقعہ معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ہوا تھا۔ اس لئے روایت میں مذکور بات درست نہیں ہو سکتی۔

جواب

جس حدیث سے ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) کو اشکال پیدا ہوا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسے من و من نقل کر دیں۔ الفاظ حدیث ملاحظہ ہوں:

أنه جاء، ثلاثة نفر قبل أن يوحى إليه وهو نائم في المسجد الحرام فقال أولهم: أيهم هو ؟ فقال أوسطهم هو خيرهم فقال أحدهم خذوا خيرهم، فكانت تلك الليلة فلم يرهم حتى أتوه ليلة أخرى فيما يرى قلبه وتنام عينه ولا ينام قلبة وكذلك الانبياء تنام أعينهم ولا تنام قلوبهم فلم يكلموه حتى احتملوا فوضعوه عند بئر زمزم ثم عرج به إلى السماء الدنيا "[16]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی اترنے سے پہلے تین فرشتے آپ کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد حرام میں سو رہے تھے، پہلے فرشتے نے کہا کہ ان تینوں میں سے وہ کون ہے؟ درمیان والے فرشتے نے کہا کہ جو ان تینوں میں سے بہتر ہے۔ آخری نے کہا کہ جو ان میں سے افضل ہے اسے لے چلو۔ اس رات کو اتنا ہی واقعہ ہوا، رسول اللہ ﷺ نے پھر انہیں نہیں دیکھا، اس کے بعد ایک رات دوبارہ وہ فرشتے آئے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ کا دل بیدار تھا اور آنکھیں سو رہی تھیں، کیونکہ آپ کا دل نہیں سوتا تھا اور تمام پیغمبروں کا یہی حال ہوتا تھا ان کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل بیدار رہتا تھا، اس دفعہ ان فرشتوں نے آپ سے کوئی بات نہیں کی اور آپ کو اٹھا کر زمزم کے کنویں کے پاس لے گئے اور آپ کا سینہ چاک کیا پھر آپ کو آسمان دنیا پر لے گئے۔۔۔"

مذکورہ حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس فرشتوں کی آمد دو دفعہ ہوئی۔ پہلی دفعہ وہ آپ ﷺ کے پاس نبوت سے پہلے آئے اور آپ کو ساتھ لے کر نہیں گئے بلکہ اس وقت صرف شناخت کر کے واپس لوٹ گئے۔ اور جب فرشتے آپ ﷺ کے پاس دوسری دفعہ تشریف لائے تو آپ اس وقت منصب نبوت پر فائز ہو چکے تھے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسراء و معراج کا واقعہ دوسری دفعہ کا ہے، کیونکہ پہلی دفعہ فرشتے آپ کو دیکھنے کے بعد باہم استفسار کر کے ہی چلے گئے تھے۔

ہمارا یہ دعوی کہ فرشتوں کی دوسری دفعہ آمد اور اسراء و معراج کا واقعہ مقام نبوت پر سرفراز ہونے سے بعد کا ہے، اس کے کئی ایک دلائل ہیں:

مذکورہ اس روایت میں فرشتوں کے دوسری دفعہ آنے کا ذکر ہے اور یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ حتى أتوه ليلة أخرى فيما يرى قلبه وتنام عينه ولا ينام قلبة وكذلك الانبياء تنام أعينهم ولا تنام قلوبهم، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ دیگر انسانوں کی مانند ایک عام انسان نہیں رہے بلکہ انبیاء کرام کی ارفع صفات سے متصف ہو چکے ہیں اور انبیاء کا یہ خاصا ہے کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل جاگتے رہتے ہیں۔ مذکورہ الفاظ سے آنکھوں کے سونے اور دل کے جاگنے کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بیان ہوئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کی دوبارہ آمد آپ کے مقام نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد کی ہے۔

- ہمارے مذکورہ دعوی کہ فرشتے دوسری دفعہ آپ کو معراج پر لے کر گئے تو اس وقت آپ کو نبوت کا تاج پہنا دیا گیا تھا، کی دوسری دلیل وہ الفاظ ہیں جو مذکورہ حدیث میں یوں وارد ہیں:

[16] صحیح بخاری مع الفتح: ۱۳/۲۷۸

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ثم عرج به إلى السماء الدنيا، فضرب بابا من أبوابها فناداه أهل السماء من هذا؟ فقال: جبريل قالوا: ومن معك؟ قال: معى محمد قالوا: وقد بعث؟ قال: نعم قالوا: فمرحبا به وأهلا[17]

جبریل علیہ السلام بیٹے کی معیت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان دنیا کے پاس پہنچے، جبریل علیہ السلام نے دروازے پر دستک دی، آسمان کے فرشتوں نے پوچھا کون ہے؟ کہا کہ میں جبریل ہوں، کہا گیا کہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ کہا کہ میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آسمان کے دربان فرشتے نے پوچھا کہ کیا ان کی بعثت ہو چکی ہے۔ یعنی منصب نبوت پر فائز ہو گئے ہیں یا نہیں، کہا ہاں، ان کی بعثت ہو چکی ہے اور سب فرشتوں نے آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا۔

اپنے موقف کے حق میں اٹھائے گئے مختلف اشکالات کو بلا تحقیق نقل کرتے جانا اور ان اشکالات کی تردید میں اہل تحقیق کے اقوال کو نظر انداز کر دینا علم کی خدمت نہیں ہے۔ کم از کم اگر اس حدیث کے الفاظ کو ہی دیکھ لیا جاتا، جس پر امام ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) نے تنقید کی ہے تو اس حدیث سے ہی اس اشکال کا جواب آسانی سے مل سکتا تھا، کیونکہ اس میں فرشتوں کے آپ کے پاس آنے کا ذکر دو دفعہ ہے، ایک دفعہ بعثت سے پہلے اور دوسری دفعہ بعثت کے بعد جبکہ آپ کو معراج کرایا گیا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) اس حدیث کے تحت اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولم يعين المدة التي بين المجيتين فيحمل على أن المجئ الثاني كان بعد أن أوحى إليه وحينئذ وقع الإسراء والمعراج واذا كان بين المجئين مدة فلا فرق في ذلك بين أن يكون تلك المدة ليلة واحدة أولليال كثيرة او عدة سينين وبهذا يرتفع الإشكال عن رواية شريك و يحصل به الوفاق أن الإسراء كان في اليقظة بعد البعثة وقبل الهجرة .[18]

رسول اللہ ﷺ کے پاس فرشتوں کی دو دفعہ آمد کے درمیان وقفہ کسی قدر تھا اس کی مدت کو معین نہیں کیا گیا، لیکن قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ دوسری دفعہ ان کی آمد تب ہی ہوئی تھی جبکہ آپ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہو چکا تھا اور اسی وقت اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا، جبکہ یہ ثابت ہوا کہ ان کی آپ کے پاس دو دفعہ آمد کے درمیان وقفہ تھا تو وہ وقفہ آپ کی بعثت سے پہلے ایک رات کا ہو یا کئی راتوں کا بلکہ کئی سالوں کا بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بایں طور شریک کی اس روایت سے اشکال رفع ہو جاتا ہے اور یہ حدیث دوسری احادیث کے ساتھ مفہوم کے لحاظ سے موافق ہو جاتی ہے کہ اسراء اور معراج آپ ﷺ کو ہجرت سے پہلے اور بعثت کے بعد بیداری میں ہوا ہے۔

- باقی رہا یہ دعوی کہ یہ حدیث اجماع امت کے خلاف ہے، تو اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

ويسقط تشنيع الخطابي وابن حزم وغيرهما بأن شريكا خالف الإجماع في دعواه أن المعراج كان قبل البعثة وبالله التوفيق [19]

اور مذکورہ جواب سے امام خطابی رحمۃ اللہ (م ۳۸۸ھ) اور ابن حزم بان (م م ۲۵۶ھ ۲۵۶ھ) کی تنقید بھی رد ہو جاتی ہے، جو کہتے ہے ہیں کہ شریک نے یہ کہہ کر اجماع کی مخالفت کی ہے کہ واقعہ معراج بعثت سے پہلے ہوا ہے۔ اللہ تعالی کی توفیق سے یہ اس کا جواب ہے جو ہم نے پیش کر دیا۔

اس حوالے سے یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ ایک حدیث اگر اجماع امت کے خلاف ہو یا تو وہ منسوخ ہو گی یا مرجوح۔ اگر شیخ یا ترجیح دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو تو ایسا دعوی اجماع جھوٹ ہے۔ پھر ایک حدیث اجماع کے خلاف ہو تو پھر بھی ضعیف کیسے ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اجتماع فن فقہ کی اصطلاح ہے اور حدیث کی تحقیق فن حدیث کے اصولوں پر کی جاتی ہے۔

خلاصہ کلام

[17] صحیح بخاری مع الفتح: ۱۳/۴۷۸

[18] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج13، ص486

[19] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج13، ص487

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ہماری مندرجہ بالا تصریحات سے ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) کے اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ واقعہ معراج بعثت کے بعد ہوا ہے اور روایت میں مذکورہ بات درست نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے واقعہ معراج کے بعثت نبوی سے پہلے ظہور پذیر ہونے کا اشارہ ملتا ہے اور یہ بات اہل علم کے اتفاق کے خلاف ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اہل علم کا اتفاق تو اس بات پر ہے کہ معراج کا نبوت کے بعد کا ہے، جبکہ فرشتوں کی آمد واقعہ معراج سے قبل ہوئی ہے کہ نہیں؟ تو اس سلسلہ میں انہیں کوئی انکار نہیں۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابو سفیان نے اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اپنی دختر ام حبیبہ کی کے ساتھ نکاح کی پیش کش کی۔[20]

اعتراض

امام ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں:

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت ام حبیبہ کے ساتھ نکاح فتح مکہ سے بہت عرصہ پہلے ہو چکا تھا، جبکہ ابو سفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے لہذا اس روایت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

جواب

اللہ تعالی نے چونکہ تمام انسانوں کو مختلف ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی حدیث سے مسائل اخذ کرنے یا ان کا حقیقی مصداق کرنے میں بسا اوقات اختلاف فکر رونما ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ظاہر بات ہے کہ کسی دلیل کی بنا پر جمہور علماء کی رائے ہی اختیار کی جائے گی اور دوسری رائے کو دلیل ہی کی بنیاد پر شاذ قرار دے کر چھوڑ دیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں اگر ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) نے بعض روایات پر اپنے بعض اشکالات کو پیش کیا ہے تو یہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ معصوم عن الخطا تو نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر دیگر آئمہ کی تنقید موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آئمہ کے شاذ اقوال کی بنیاد پر تحقیق روایت میں سند کو چھوڑ کر متن کے بل بوتے پر داد تحقیق دینے کا دعوی کرتے ہیں، ان کی بات عقلا محال ہے، کیونکہ فقہاء کے مختلف اقوال بھی ہماری طرف روایت ہی کی جہت سے منقول

ہوئے ہیں۔

واقعہ کا پس منظر

اس واقعہ کا پس منظر سامنے رہے تو یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ ابو سفیان نے اپنی بیٹی عزہ جس کی کنیت ام حبیبہ تھی، سے نکاح کرنے کی آپ ﷺ کو پیش کیوں کی تھی؟ اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی ہی ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف سے باقاعدہ وضاحت موجود ہے کہ ابو سفیان کے اسلام قبول کرنے کے باوجود مسلمان ان کی طرف توجہ کرتے اور نہ ان کے ساتھ بیٹھتے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر رسول اللہ سے یہ درخواست کی کہ ان کی بیٹی ام حبیبہ سے آپ نکاح فرمالیں۔

اس تناظر میں ہم ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) کے اس شاذ قول کی تردید میں ذیل میں بعض آئمہ سلف کے اقوال نقل کر رہے ہیں:

- حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) کی یہ تقید علامہ صنعانی رحمۃ اللہ (۱۱۸۲۴) کی توضیح الافکار کے ص ۱۳۸ پر موجود ہے، مگر علامہ صنعانی رحمۃ اللہ (م ۱۱۸۲ھ) نے امام ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۵۴۵۶) کے اعتراض کو نقل کرنے کے متصل بعد خود ہی ابن حرم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶۴ھ) کی طرف سے پیش کیے گئے اشکال کے مختلف جوابات ذکر کئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ ابو سفیان ایران نے ام حبیبہ کے رشتے کی بابت بات نہیں کی تھی بلکہ ان کی بہن عزہ سے رشتے کی پیش کش کی تھی، بلکہ اس سے قبل ایک دفعہ خود حضرت ام حبیبہ نے بھی اپنی اس بہن سے نکاح کرنے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا: ایک آدمی کے نکاح میں دو سگی بہنیں جمع نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ابو سفیان نے بھی آپ سے عزہ سے نکاح کرنے کا اظہار کیا تھا لیکن راوی نے غلطی سے عزہ کی بجائے ام حبیبہ کہہ دیا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ (م ۷۵۱ھ) نے اس سلسلہ میں ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۲ھ) کے اشکال کا جواب دیتے ہوئے ایک بات کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔

عزہ کی کنیت بھی اپنی بہن کی کنیت پر ام حبیبہ ہی تھی، لہذا عزہ کو ام حبیبہ کہنے میں بھی راوی نے کوئی غلطی نہیں کی۔

---

[20] امام، مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح مسلم، (2009)، فرید بک سٹال اردو بازار، لاہور، حدیث 2409

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

المختصر ابن قیم رحمۃ اللہ (م ۷۵۱ھ) اور امام صنعانی رحمۃ اللہ (۱۱۸۲۴ھ) کی توضیحات بالکل معقول معلوم ہوتی ہیں جو کہ مذکورہ حدیث پر ابن حزم رحمۃ اللہ (م ۴۵۶ھ) کی طرف سے پیش کردہ اشکال کا کافی شافی جواب ہیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

امام ابن قیم رحمۃ اللہ (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ میری ذکر کردہ توجیہ کے باوجود یہاں ایک اور اشکال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ آپ نے حضرت ابو سفیان کے ہر مطالبے کے جواب میں "نعم" کہہ کر اسے قبول کیا تھا، حالانکہ ام حبیبہ کے آپ کے نکاح میں ہوتے ہوئے آپ اس کی بہن عزہ سے نکاح کی پیش کش کو قبول نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ دو بہنوں کا ایک آدمی کے نکاح میں جمع ہونا حرام ہے۔ اس کا جواب امام ابن قیم رحمۃ اللہ (م ۷۵۱ھ) نے ہی یوں دیا ہے کہ آپ نے ابو سفیان کے تمام مطالبات نہیں بلکہ ان میں سے بعض قبول کئے تھے جن کا قبول کرنا ممکن تھا یعنی ابو سفیان م کے کہنے پر ان کے بیٹے حضرت معاویہ کو کاتب وحی بنالیا تھا، لیکن عزہ سے نکاح کرنا چونکہ ناممکن تھا اس لئے آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔"[21]

صحیح بخاری میں واقعہ معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر نمازوں میں تخفیف کے لئے بار ہا اللہ تعالی کے پاس جاتے رہے، آخری مرتبہ جب آپ واپس ہوئے اور موسیٰ نے پھر واپس جانے کو کہا تو آپ ﷺ نے انہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنایا کہ ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَى) یعنی اس حکم میں مزید کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ، لیکن موسیٰ نے پھر بھی آپ سے دوبارہ جانے کے لئے کہا۔

اعتراض

محدث داؤدی رحمۃ اللہ (م ۴۰۲ھ) فرماتے ہیں:

یہ بات درست نہیں کیونکہ باقی تمام روایات اس کے بر خلاف بیان کرتی ہیں نیز موسی اللہ تعالیٰ کا ارشاد سننے کے بعد آپ کو دوبارہ جانے کا نہیں کہہ سکتے۔[22]

جواب

کلام خواہ نبی کا ہو یا غیر نبی کا، اس کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، بالکل وہی اشکالات اور اعتراضات اس وقت در آتے ہیں کہ جب مخصوص فکر و خیال کو پیش نگاہ رکھ کر شریعت اسلامیہ کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمارے خیال میں جس حدیث کے الفاظ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، اگر اس پر غور کر لیا جاتا تو رواۃ حدیث کو غلط کہنے کی بجائے امام داؤدی (۴۰۲۴ھ) کی غلطی واضح ہو جاتی کیونکہ معراج کی رات آخری دورہ میں رسول اللہ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ تو فرمایا تھا کہ اللہ تعالی نے میری امت کے لئے ایک نیکی کرنے پر دس نیکیاں دینے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اب اپنے حکم میں کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی کرانے سے روک دیا ہے۔ دیکھئے آخری بار آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو (لایبدل القول لدی) کے بارے میں بتایا نہیں تھا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے یہ ارشاد سنا تھا اس لئے دوبارہ جانے کا مشورہ دیا تھا

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فقال الجبار يا محمد قال لبيك وسعديك قال لا يبدل القول لدى كما فرضت عليك في ام الكتب قال فكل حسنة بعشر أمثالها فهي خمسون في ام الكتاب وهي خمس عليك فرجع إلى موسى فقال: كيف فعلت فقال خفف عنا أعطانا بكل حسنة عشر أمثالها قال موسى قدو الله راودت بنى اسرائيل على أدنى من ذالك فتركوه ارجع الى ربك فليخفف عنك أيضا قال رسول الله □ يا موسى قد والله استحييت من ربي مما اختلفت اليه قال فاهبط باسم الله [23]

---

[21] زاد المعاد: ۱/۱۱۳

[22] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج13، ص486

[23] صحیح بخاری مع فتح الباری: ۱۳/۴۷۹

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ارشاد ہوا اے محمد ! آپ نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں اور حکم کی بجاآوری کے لئے مستعد ہوں، فرمایا میری بات نہیں بدلے گی۔ جیسا کہ لوح محفوظ میں آپ پر فرض کر دی گئی تھی اور ہر نیکی کا ثواب دس گناہ ہو گا۔ لوح محفوظ کے مطابق پچاس نمازیں آپ پر پانچ ہوئیں، اس کے بعد آپ حضرت موسیٰ کی طرف واپس آئے، انہوں نے پوچھا کیوں کیا ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی نے ہم پر بہت تخفیف فرمادی، ہر نیکی کے بدلے دس نیکیوں کا ثواب عطا فرمایا ہے۔ حضرت موسیٰ کہنے لگے، اللہ کی قسم میں نے بنی اسرائیل سے پانچ سے بھی کم نمازیں پڑھنے کا مطالبہ کیا تھا لیکن انہوں نے چھوڑ دیا، لہذا پھر جاؤ اور پروردگار سے تخفیف کراؤ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں کئی بار اپنے رب کے پاس جا چکا ہوں اب جاتے مجھے حیا آتی ہے، فرمایا پھر اللہ کا نام لے کر زمین پر اترو۔[24]

مذکورہ بالا روایت کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہو رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری بار موسی علیہ السلام کو (مایُبدل القول لدی) کے بارے میں بتایا ہی نہیں، چنانچہ محدث داودی رحمتہ اللہ (م ۴۰۲ھ) کا یہ دعوی بالکل بے جا ہے کہ رسول اللہ صل ﷺ نے موسی کو(مَا يُبَدَّلُ الْقَولُ لَدَى)والی آیت کریمہ سنائی اور جہاں تک محدث داوودی کے دوسرے دعوی کا تعلق ہے کہ موسی علیہ السلام نے کلام الہی سننے کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کا کہہ ہی نہیں سکتے، یہ دعوی بالکل بجا ہے کیونکہ جب موسی علیہ السّلام نے فرمان الہی سنا ہی نہیں تو اس کی خلاف ورزی کیونکر کر سکتے ہیں، کیونکہ پہلا دعوی ہی ثابت نہیں ہو سکا۔ جب حقیقت حال یہ ہے تو اس روایت سے یہ دلیل کیسے تراشی جاسکتی ہے اور بخاری جیسی اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی روایات کو مشکوک کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

- صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر جب ان سے روایت کہیے کہ جب عبداللہ بن ابی منافق کا انتقال ہوا، تو رسول اللہ ﷺ نے کفن دینے کے لئے اپنی قمیص دی، پھر اس کا جنازہ پڑھانے کے لئے اٹھے تو حضرت عمر نے کہا:

تصل عليه وهو منافق وقد نهاك الله أن تستغفر لهم . قال رسول الله إنما خيرني الله فقال: استغْفِرْ لَهُمْ أوْ لا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إن تَسْتَغْفِرُ لهم سبعين مركا فلن يغفر الله لهم ، فقال: سأزيده على سبعين [25]

"کیا آپ منافق کا جنازہ پڑھائیں گے، آپ نے فرمایا مجھے اللہ نے اختیار دیا ہے اس لئے میں ستر سے زیادہ مرتبہ دعا کروں گا تا کہ اس کی مغفرت ہو جائے اس کے بعد آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اعتراض

اس روایت کو کافی محدثین عظام رحمتہ اللہ نے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ خود حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ (۸۵۲۴ھ) لکھتے ہیں:

واشتشكل فهم التخيير من الآية حتى أقدم جماعة من الأكابر على الطعن في صحة هذا الحديث مع كثرة طرقه واتفاق الشيخين وسائر الذين خرجوا الصحيح على تصحيحه أنكر القاضي أبو بكر صحة هذا الحديث وقال: لا يجوز أن يقبل هذا ولا يصح أن الرسول قاله انتهى ، ولفظ القاضي أبي بكر الباقلاني في التقريب هذا الحديث ميں أخبار الآحاد التي لا يعلم ثبوتها ، وقال إمام الحرمين في مختصره هذا الحديث غير مخرج في الصحيح وقال في البرهان لا يصحه أهل الحديث وقال الغزالي في المستصفى الأظهر أن هذا الخبر غير صحيح وقال الداوودى الشارح: هذا الحديث غير محفوظ "[26]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آیت سے اختیار کا مفہوم اخذ کرنا محل اشکال سمجھا گیا ہے، اس لیے اکابر اہل علم کی ایک جماعت نے باوجود یکہ اس سند میں بہت سی ہیں اور شیخین، نیز صحیح احادیث جمع کرنے والے دوسرے محدثین اس کے صحیح ہونے پر متفق ہیں۔۔۔اس حدیث کی صحت پر اعتراض کیا ہے۔ قاضی ابو بکر نے اس حدیث کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کو قبول کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کا ایسا فرما سکتے ہیں۔ قاضی ابو بکر تقریب میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث ان اخبار احاد میں سے ہے جن کا ثبوت مشکوک ہے۔ امام الحرمین رحمتہ اللہ (م ۵۳۷۸) کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح احادیث کے زمرے میں نہیں آتی اور برہان

---

[24] صحیح بخاری مع الفتح: ۱۳/۴۷۹

[25] صحیح بخاری: ۴۶۷۲

[26] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص338

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

میں ان کا یہ قول موجود ہے کہ اس کو علمائے حدیث صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ (م ۵۰۵ھ) المستصفی میں لکھتے ہیں کہ اس کا غیر صحیح ہونا بالکل واضح ہے۔ داوودی رحمۃ اللہ (م ۴۰۲ھ) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔"

جواب

قرآنی آیت :(اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أو لا تستغفر لهم)پر غور کیا جائے تو اس میں لفظ اَو استعمال ہوا ہے جو تخییر کے لئے ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں: ((اِنما خیرنی اللہ)) کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے لئے استغفار کرنے، نہ کرنے میں اختیار دیا ہے یعنی ابھی تک منع نہیں کیا، اس پر یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ کے آیت سے اختیار کا مفہوم اخذ کرنے میں اشکال ہے۔ آپ کے مقام نبوت پر اعتراض ہے جو کسی امتی کو زیب نہیں دیتا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

حدیث نبویہ کو متفق اصولوں سے رد کر دینے والوں کی عجیب نفسیات ہیں کہ اگر کوئی محدث اہل علم میں سے کسی کا اشکال اس لئے نقل کرتا ہے تاکہ وہ اس کا جواب دے۔ تو ان بے چاروں کو اشکال تو نظر آجاتا ہے جو صحیح حدیث پر کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس اشکال کا جواب نقل کرنے سے ان کا قلم قاصر رہتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) کو ہی لے لیجئے جو حدیث نبوی کے بہت بڑے خادم ہیں۔ وہ حدیث پر اپنی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کرتے، ہاں دیگر حضرات کے اٹھائے ہوئے اشکالات کے دلائل کے ساتھ جوابات ضرور دیتے ہیں۔ زیر نظر حدیث میں بھی انہوں نے بعض اہل علم کے اشکالات کو اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ ان کی تردید کریں، لیکن نام نہاد درایت کے دعویداروں نے ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) کو بھی منکرین حدیث کی صف میں لاکھڑا کیا اور کہا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا آیت سے اختیار کا مفہوم اخذ کرنا محل اشکال سمجھا گیا ہے، حالانکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (۸۵۲ھ) دیگر اہل علم کے اشکالات کو اس لئے ذکر کر رہے ہیں تاکہ ان کے جوابات دے سکیں اور انہوں نے ہر اعتراض کا جواب دے کر اس کی تردید بھی کر دی ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ البتہ ان کی وہ عبارت جو اس حدیث پر اعتراضات کرنے والوں نے اوپر ذکر کی ہے، اس کا تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے مکمل طور پر فتح الباری سے نقل کر دیا جائے۔ فتح الباری میں حافظ صاحب کے الفاظ یوں نقل ہیں :

أقدم جماعة من الأكابر على الطعن في صحة هذا الحديث مع كثرة طرقه و اتفاق الشيخين و سائر الذين خرجوا الصحيح على تصحيحه وذلك ينادى على منكرى صحته بعدم معرفة الحديث و قلة الاطلاع على طرقه قال ابن المنير : مفهوم الآية زلت فيه الأقدام "[27]

یہ حدیث بہت سی اسانید سے مروی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ (م ۲۵۶ھ) اور امام مسلم رحمۃ اللہ (م ۲۶۱ھ) نیز ان کے طریقہ تصحیح پر صحیح احادیث نقل کرنے والے علماء نے بھی اس کی صحت پر اتفاق کیا ہے اس کے باوجود اکابر اہل علم کی ایک جماعت نے اس حدیث کی صحت کو ہدف طعن بنایا ہے اور یہ چیز ان کی فن حدیث میں عدم مہارت اور اس کی کثرت اسانید سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور ابن منیر رحمۃ اللہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ آیت قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں اکثر علماء کے قدم پھسل گئے ہیں۔

آپ غور کریں کہ مذکرہ عبارت میں ابن حجر رحمۃ اللہ (۸۵۲ھ) اعتراض کرنے والے علماء کے ساتھ کھڑے ہیں یا ان کا مبلغ علم بیان فرما رہے ہیں۔ اعتراض کرنے والوں نے مکمل عبارت کو یوں نقل کیا ہے کہ گویا ابن حجر رحمۃ اللہ (۸۵۲ھ) اعتراض کرنے والے علماء کے ہم نوا ہیں، جبکہ درمیان عبارت میں کچھ فقرے چھوڑ دیے، جن میں در حقیقت ابن حجر رحمۃ اللہ (م ۸۵۲ھ) نے ان اہل علم کے مبلغ علم پر تبصرہ فرمایا ہے۔ اس قسم کی بدنیتی کی امثلہ علمائے حدیث کے ہاں ہر گز نہیں ملتیں، جس قسم کی مثالیں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے منکرین حدیث پیش کرتے ہیں۔

بعض فوائد

[27] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص338

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

1. اوپر ذکر کی گئی تمام احادیث کے بارے میں جو چیز دوران تحقیق سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ محدثین کرام کے حوالے سے پیش کیے جانے والے مذکورہ تمام اقوال کے نقل کرنے میں اہل درایت کی علمی دیانت کا عالم یہ ہے کہ ان اقوال کو انہوں نے جن مصادر کے حوالے سے پیش کیا ہے، وہاں ان اقوال کو مؤلفین لائے ہی اس لیے تھے کہ ان کا حل نقل کریں، لیکن ان لوگوں نے اپنے مطلب کی بات وہاں سے اخذ کر لی اور وہ جوابات چھوڑ دیے، جو وہاں مولفین نے ان اقوال کو ذکر کر کے تفصیلاً ذکر کیے تھے۔
2. صحیحین وغیرہ کی مذکورہ روایات میں سے اکثر میں عموماً نظر آرہا ہے کہ جب بعض اہل علم دو متعارض صحیح نصوص میں جمع نہیں کر پاتے تو وہ اپنے فہم کے اعتبار سے ترجیح کے طرق پر چلتے ہوئے درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

- بسا اوقات کسی بات کو راویوں کا وہم کہہ دیتے ہیں۔
- یا کہہ دیتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے جس کی نسبت شریعت کی طرف کرنے کے بجائے راویوں کی طرف کرنی چاہیے۔
- یا کہتے ہیں کہ یہ روایت متروک یا منکر ہے۔
- یا کہتے ہیں کہ روایت میں بیان کردہ بات محل اشکال ہے وغیرہ

اس قسم کے تمام اقوال راوی پر جرح وتعدیل کے ضمن میں نہیں آتے کیونکہ راوی کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ اصل کے اعتبار سے نہیں بلکہ تعارض کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راوی کی طرف ان امور کے قبیل سے اس قسم کی نسبت سے محدثین کرام کے ہاں بالاتفاق راوی ضعیف نہیں ہوتا بلکہ روایت پر ضعف (یعنی ضعف افوی، جسے اصطلاحات محدثین میں توقف اور مرجوح یا شاذ یا معلول وغیرہ کے لفظ سے بیان کیا جاتا ہے) کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عالم اس تعارض کو ویسے ہی حل کر دے تو پھر راوی کی طرف ایسی نسبت از خود اضافی قرار پا جاتی ہے۔

مشکل الآثار یا مختلف الحدیث کے موضوع پر جن محدثین عظام نے کام کیا ہے ان میں سے کئی محدثین کرام کا دعوی ہے کہ ذخیرہ حدیث میں کوئی حدیث بھی دوسری حدیث سے متعارض نہیں۔ جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ (م ۲۴۱ھ) اور امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ (م ۳۱۱) وغیرہ جیسے آئمہ کا دعویٰ ہے کہ ایک بھی ایسی صحیح روایت پیش نہیں کی جاسکتی کہ جو دوسری صحیح روایت سے ٹکراتی ہو، اگر کسی کو کسی روایت کے بارے میں اشکال ہے تو لاؤ اسے ہم جمع کر کے دکھاتے ہیں۔"[28]

البتہ اصول یہ ہے کہ اگر کوئی دو روایات کو محدثین عظام رحمۃ اللہ جمع نہ بھی کر پائیں تو وہ انہیں ضعیف کہے بغیر (توقف فرماتے ہوئے)

دیگر علماء کے لئے میدان چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان روایات کا کوئی حل پیش کر دیں۔

واضح رہے کہ بعض محدثین مختلف صحیح روایات میں جمع وتوفیق کے جو متعدد طریقے اختیار کرتے ہیں یا ایک محدث ترجیح دیتا ہے، لیکن دوسرا جمع کر دیتا ہے، تو یہ ساری بحث تحقیق حدیث کے موضوع سے خارج ہے اور تاویل حدیث کا موضوع ہے۔ چنانچہ ترجیح وغیرہ کی مباحث کے باوجود روایت صحیح رہتی ہے، ضعیف نہیں ہو جاتی ۔ چنانچہ یہ سارے نکات بعد از وقوع کے قبیل کی چیزیں ہیں، شریعت کی نصوص نہیں! اس لیے فہم وتدبر سے متعلقہ چیزوں کو شرعی نص سمجھتے ہوئے ان کی بنیاد پر شرع کو ضعیف ہر گز نہیں کہا جاسکتا ہے۔

جب روایات میں تعارض ہو یا جس روایت میں اشکال ہے اسے نقل کرنے میں راوی متفرد ہو تو اس قسم کی احادیث میں اگر اشکال حل نہ ہو سکے تو محدثین کرام کے ہاں ایسی صورت علل الحدیث کی بحث سے تعلق رکھتی ہے، جس میں وہ مخفی اور قادح عیوب کی بنا پر اپنے فنی ذوق کی روشنی میں وہم کی نسبت روایت کے کسی راوی کی طرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام اقوال، جن کو منکرین حدیث ورایت کا نام لے کر اپنے موقف کے اثبات میں پیش کرتے ہیں، وہ انفرد روایت کے درایتی معیار کے بجائے محدثین کرام کے ہاں علل الحدیث کی بحث ہے، جس میں حدیث پر حکم لگانے میں محدثین کرام کا کیا منہج ہے؟

[28] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص338

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

ذیل میں چند امثلہ مزید نقل کی جارہی ہیں جن کا تعلق محدثین کرام رحمتہ اللہ کے ہاں علل الحدیث کی بحث سے ہے اور انہوں نے اپنے اپنے اعتبار سے کسی اشکال کو اٹھا کر روایت میں علت کی نشاندہی کی ہے، جبکہ اس کے بالمقابل اہل درایت نے ان اقوال کو پیش کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ محدثین کرام ان کے خود ساختہ تصور درایت کے مؤید ہیں۔

- صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لم يكذب إبراهيم عليه السلام إلا ثلاث كذبات [29]

ابراہیم نے پوری زندگی میں صرف تین جھوٹ بولے ہیں۔

اس روایت کے بارے میں امام رازی رحمۃ اللہ (م۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیر میں اس روایت کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لأن يضاف الكذب إلى رواته أولى من أن يضاف إلى الأنبياء عليهم الصلوة والسلام "[30]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ان تین جھوٹوں کی نسبت کرنے سے بہتر ہے کہ اس کی نسبت روایت کے راویوں کی طرف کی جائے۔"

- مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إن يأجوج ومأجوج ليحفرون من السد كل يوم حتى إذا كادوا يرون شعاع الشمس قال الذي عليهم ارجعوا فتستحفرونه غدا فيعودون إليه كأشد ما كان حتى إذا بلغت مدتهم وأراد الله عز وجل أن يبعثهم على الناس حفروا حتى إذا كادو يرون شعاع الشمس قال الذي عليهم ارجعوا فتستحفرونه غدا إن شاء الله فيستثنى فيعودون إليه وهو كهيئته حين تركوه فيحفرونه ويخرجون على الناس [31]

یاجوج وماجوج ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کو روزانہ کھودتے ہیں، یہاں تک کہ جب سراغ میں سے سورج کی کرنیں اندر آنے لگتی ہیں تو ان کا نگران کہتا ہے کہ اب واپس لوٹ چلو کل ہم اس دیوار کھود ڈالیں گے۔ لیکن اگلے دن وہ آتے ہیں تو دیوار دوبارہ نہایت مضبوطی بند ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ان کی قید کی مدت پوری ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں پر مسلط کرنا چاہیں گے تو ایک دن وہ دیوار کو کھود دیں اور جب سورج کی کرنیں اندر آنے لگیں گی تو نگران کہے گا کہ اب واپس چلو ان شاء اللہ ہم کل اس دیوار کو کھود لیں گے۔ ان شاء اللہ کہنے کی وجہ سے جب وہ اگلے دن آئیں گے تو دیوار ہی حالت پر ہو گی جس پر وہ کل اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس کو کھود کر باہر نکل آئیں گے۔"

یہ روایت بظاہر قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے:

فَمَا اسْطَاعُوا أن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نقبا [32]

نہ وہ اس دیوار کو سر کر سکے اور نہ اس میں سراخ ہی کر سکے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ (م۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

إسناده جيد قوى ولكن متته في رفعه نكارة، لأن ظاهر الآية يقتضى أنهم لم يتمكنوا من ارتقائه ولا من نقبه لأحكام بنائه وصلابته وشدته ولكن هذا قد روى عن كعب الأحبار ولعل أبا هريرة تلقاء من كعب فإنه كان كثير ما كان يجالسه ويحدثه فحدث به أبو هريرة فتوهم بعض الرواة أنه مرفوع فرفعه [33]

---

[29] صحیح بخاری: ۳۳۵۸

[30] تفسیر کبیر: ۲۲/۱۸۵

[31] مسند احمد: ۲/۵۱۰

[32] الکھف: ۹۷

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

- صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

خلق الله التربة يوم السبت وخلق فيها الجبال يوم الأحد وخلق الشجر يوم الإثنين وخلق المكروه يوم الثلثاء وخلق النور يوم الأربعاء وبث فيها الدواب يوم الخميس وخلق آدم عليه السلام بعد العصر من يوم الجمعة في آخر الخلق "[34]

اللہ تعالی نے ہفتہ کے دن زمین کی سطح کو پیدا کیا۔اتوار کے دن پہاڑوں کو، پیر کے دن درختوں کو منگل کے دن بری چیزوں کو، بدھ کے دن روشنی کو، جمعرات کے دن زمین میں چوپاہوں کو پھیلایا اور سب سے آخر میں جمعہ کے دن عصر کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔"

اس روایت کو جلیل القدر محدثین رحمۃ اللہ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔علامہ مناوی رحمۃ اللہ (م ۱۰۳۱ھ) فرماتے ہیں:

قال الزركشي: أخرجه مسلم وهو من غرائبه وقد تكلم فيه ابن المديني والبخاري وغيرهما من الحفاظ وجعلوه من كلام كعب الأحبار وأن أبا هريرة إنما سمعه منه لكن اشتبه على بعض الرواة فجعله مرفوعا[35]

"امام زرکشی رحمۃ اللہ (م ۷۹۴ھ) کہتے ہیں کہ یہ روایت امام مسلم رحمۃ اللہ (م ۲۶۱ھ) کی نقل کردہ غریب روایات میں سے ہے۔اس روایت میں امام ابن مدینی رحمۃ اللہ (۲۳۴) ،امام بخاری رحمۃ اللہ (م ۲۵۶ھ) اور دیگر حفاظ حدیث نے کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دراصل کعب احبار رحمۃ اللہ کا کلام ہے، جو ان سے ابوہریرہ نے سنا لیکن پھر کسی راوی کو اشتباہ ہوا اور اس نے اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر دی۔

اس روایت کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ: (م ۷۲۸ھ) نے بھی مجموع فتاوی [36] اور اپنی کتاب علم الحدیث پر ہدف تنقید ٹھہرایا ہے۔ نیز حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ (م ۷۵۱ھ) نے بھی زاد المعاد میں اور اپنی کتاب المنار المنیف [37] پر اس حدیث پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔

- صحیح بخاری میں نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

كنا في زمن رسول الله □ لا تعدل بأبي بكر أحدا ثم عمر ثم عثمان ثم نترك أصحاب النبي لا تفاضل بينهم[38]

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ہم عہد رسالت میں فضیلت کے اعتبار سے بالترتیب ابو بکر صدیق، پھر عمر فاروق، پھر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو درجہ دیتے تھے اور ان اصحاب ثلاثہ کے ماسوی اصحاب رسول میں سے کسی کی کسی دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں سمجھتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ: (م ۴۶۳ھ) اس روایت پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إن هذا الحديث خلاف قول أهل السنة أن عليا أفضل الناس بعد الثلاثة فإنهم أجمعوا على أن عليا افضل الخلق بعد الثلاثة ودل هذا الإجماع على أن حديث ابن عمر غلط وإن كان السند إليه صحيحا [39]

یہ حدیث اہل سنت کے اجماعی موقف کے خلاف ہے کہ اصحاب ثلاثہ کے بعد حضرت علی کو صحابہ میں چوتھا درجہ حاصل تھا۔اس لیے باوجود اس روایت کی سند ابن عمر سے بالکل ثابت ہے لیکن اس میں پیش کی گئی بات اجماع کے مخالف ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔

- صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خلق الله آدم وطوله ستون ذراعا فلم يزل الخلق ينقص حتى الآن[40]

---

[33] تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۰۵

[34] امام، مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح مسلم، (2009)، فرید بک سٹال اردو بازار، لاہور، حدیث 7054

[35] المناوی، محمد عبدالرؤف بن تاج الدین: فیض القدیر شرح جامع الصغیر، دار المعرفۃ، بیروت ۱۳۹۱ھ- : ۳/۴۴۸

[36] مجموع فتاوی از ابن تیمیہ: ۱۸/۱۸

[37] المنار المنیف: ص ۸۶

[38] صحیح بخاری: ۳۶۹۸

[39] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج 7، ص 16

".اللہ تعالی نے جب آدم کو پیدا فرمایا تو ان کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا تھا۔اس کے بعد سے لے کر اب تک مخلوق کا قد برابر چھوٹا ہوتا چلا آرہا ہے۔"

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

ويشكل على هذا ما يوجد الآن من آثار الأمم السالفة كديار ثمود فإن مساكنهم تدل على أن قامتهم لم تكن مفرطة الطول على حسب ما يقتضيه الترتيب السابق ولكن شك أن عهدهم قديم وأن الزمان الذي بينهم وبين آدم دون الزمان الذي بينهم، وبين أول هذه الأمة ولم يظهر لي إلى الآن ما يزيل هذا الإشكال ..[41]

اس روایت پر یہ اشکال ہے کہ گزشتہ اقوام، مثلا قوم محمود کے آثار اور بستیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد ہمارے قد کے بالمقابل اپنے لیے نہیں تھے جتنا کہ حدیث میں بیان کردہ ترتیب تقاضا کرتی ہے۔ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ان کے اور آدم کے مابین زمانی فاصلہ اس سے کم ہے، جو ان کے اور اس امت کے دور اول کے مابین ہے۔تاحال میرے سامنے کوئی ایسی توجیہ نہیں آئی جس سے یہ اشکال زائل ہو جائے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ (۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ (م۸۰۸ھ) نے بھی اس روایت کو اس بنا پر رد کیا ہے۔ [42]

- سنن نسائی میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إن الشمس والقمر لا ينكسفان لموت أحد ولا لحياته ولكنهما آيتان من آيات الله عز وجل. إن الله عز وجل إذا بدأ لشئ من خلقه خشع له[43]

سورج اور چاند کو کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ یہ تو اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ گرہن لگنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالی اپنی حقوق میں سے کسی چیز پر تجلی ڈالتے ہیں تو وہ خشوع و عجز کا اظہار کرتی ہے۔"

امام ابن حجر رحمۃ اللہ (۸۵۲ھ) اس روایت کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ (م۵۰۵ھ) کا تبصر نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إنها لم تثبت فيجب تكذيب ناقلها قال ولو صحت لكان تأويلها أهون من مكابرة أمور قطعية لا تصادم أصلا من أصول الشريعة "[44]

یہ بات ثابت نہیں، لہذا اس کے راوی کی تکذیب واجب ہے۔اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کی تاویل کرنا ان قطعی امور کے بے جا انکار سے بہتر ہے، جو شریعت کی کسی اصل سے نہیں ٹکراتے۔

- سنن ابی داؤد میں حضرت علی سے بکریوں کی زکوۃ کے بارے میں روایت ہے کہ اگر بکریوں کی تعداد پچیس ہو تو ان میں سے پانچ بکریاں زکوۃ کے طور پر وصول کی جائیں۔چونکہ جانوروں کی زکوۃ کے معروف نصاب کے حوالے سے پچیس بکریوں میں پانچ بکریوں کی زکوۃ بہت زیادہ ہے۔

امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ (۲۲۴ھ) امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ (م۱۲۱ھ) کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

كان أفقه من أن يقول ذلك "[45]

حضرت علی جیسے فقیہ اور مجتہد سے ایسی کمزور بات منقول ہونا بہت بعید ہے۔

---

[40] صحیح بخاری: ۳۳۲۶

[41] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج6، ص327

[42] انور شاہ الکشمیری، محمد فیض الباري علی صحیح البخاري، خضر راہ بک ڈپو، دیوبند ۴/۱۲ :۱۹۸۰۰

[43] سنن النسائي: ۱۳۸۲

[44] القاسم بن سلام، أبوعبید البروی کتاب الاموال تحقیق: محمد خلیل ھراس، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۶ء: ص ۳۶۳

[45] امام الحافظ، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری، (2011)، مکتبہ اسلامیہ، ج8، ص338

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

جامع ترمذی میں واقعہ افک کی روایت میں ذکر ہے کہ سیدہ عائشہ پر الزام لگانے والوں میں سے حضرت حسان بن ثابت بھی تھے، اس لیے ان پر بھی حد قذف جاری ہوئی تھی۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ (۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ حضرت حسان کے اشعار میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ وہ تو حضرت عائشہ کی عفت و عصمت کا دفاع کرنے والے تھے۔

والعبرة عندی بأخذ قول الحسان نفسه ولا عبرة بما يذاع بين الناس ويشاع فإن حال الخيط في الأخبار معلوم وبالجملة نسبة القذف إليه عندی خلاف التحقيق وكذا من جعله مصداقا لقوله والذي تولى كبره باطل عندی

میرے نزدیک خود حضرت حسان کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیے، لوگوں کے مابین جو باتیں مشہور ہو جاتی ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ روایات میں واقع ہونے والی گڑ بڑ کا حال معلوم ہے۔ خلاصہ یہ ہے حضرت حسان کی طرف قذف کی نسبت میرے نزدیک خلاف تحقیق ہے۔ اسی طرح ان کو والذی تولی کبرہ کا مصداق قرار دینا میرے نزدیک بالکل بے بنیاد ہے۔"

صحیح مسلم کی مختلف روایات میں صلوۃ کسوف کے بارے میں آپ مہم کا عمل یہ ذکر ہوا ہے کہ آپ نے صلوۃ الکسوف میں دو یا تین یا چار رکوع فرمائے۔ ان روایات کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ (م۷۲۸) ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأربع ركوعات أنه إنما صلى ذلك يوم مات إبراهيم ومعلوم أن إبراهيم لم يمت مرتين ولا كان له إبراهيمان وقد تواتر عنه أنه صلى الكسوف يومئذ ركوعين في كل ركعة كما روى ذالك عنه عائشة وابن عباس و ابن عمرو وغيرهم فلهذا لم يرو البخاري إلا هذه الأحاديث وهذا حذف من مسلم ولهذا ضعف الشافعي وغيره أحاديث الثلاثة والأربعة ولم يستحب ذالك وهذا أصح الروايتين عن أحمد وروى عنه أنه كان يجوز ذالك قبل أن يتبين له ضعف هذه الأحاديث [46]

خاتمہ

مذکورہ ساری بحث سے واضح ہو گیا کہ جن محدثین اور صحابہ کے حوالے سے علم حدیث میں درایت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے،

1. اول تو ان صحابہ کرام اور محدثین کے یہاں ان چیزوں کو تحقیق روایت میں علامت کی حیثیت دی جاتی ہے، نہ کہ علت کی۔
2. دوسرا یہ کہ انہوں نے متن سے متعلقہ ضروری قسم کی درایت کا خود مکمل و شافی اہتمام کیا ہے۔
3. تیسرا یہ کہ متن کی ضروری تحقیق کرتے ہوئے اگر وہ مشکل حل نہیں ہو پائی، تو سند صحیح ہونے کی وجہ سے روایت کو ضعیف کہے بغیر متن اور روایت کے معنی کو ایک خاص وقت تک کیلئے چھوڑ دیا ہے۔

چنانچہ درایتی معیار کے قائلین کے بقول عین الاصابہ وغیرہ کتب کے حوالے سے ام المومنین حضرت عائشہ اور دیگر صحابہ پانے جو بعض صحابہ کی روایات پر تبصرہ فرمایا ہے، تو در حقیقت ان صحابہ کی روایات کو رد نہیں کیا گیا، بلکہ ان صحابہ کا رسول اللہ سے اخذ کردہ مفہوم سے اختلاف کیا گیا ہے۔ یہی وجہ کہ محدثین اس طرح کی تمام روایات کو اپنی کتب میں صحیح احادیث کے ضمن میں پیش کرتے ہیں اور حل نہ ہونے والے اختلاف کو ضعیف کہنے اور چھوڑنے کے بجائے اس پر توقف کرتے ہیں۔ نیز اگر ترجیح بھی دیں تو ترجیح دینے کے باوجود مرجوح روایات کو صحیح احادیث میں ہی بیان کرتے ہیں کہ ممکن کہ اس قسم کی روایت کا کوئی معنی کسی خاص حالات کے پیش نظر کسی اور وقت کھل جائے، جیسا کہ عدالتوں میں پڑی مقدمات کی فائلیں کئی کئی سال بعد کوئی حل نکلنے کی صورت میں دوبارہ کھل جاتی ہیں۔

اسی طرح ہماری گذارشات سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ احادیث نبویہ میں سے کوئی حدیث بھی اپنے متن کے اعتبار سے عقل کے خلاف نہیں ہے اور منکرین حدیث کی طرف سے جن احادیث رسول کو عقل یا مسلمات کے منافی سمجھ لیا گیا ہے، وہ صرف عدم تدبر اور ان میں عقل سلیم کے ساتھ غور و فکر نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ علمائے حدیث ان احادیث ثابتہ کو سنجیدگی کے ساتھ زیر غور لائے ہیں، جنہیں منکرین حدیث کے مختلف گروہوں کی طرف سے خلاف قرآن، یا خلاف سنت، یا

[46] مجموع فتاوی: ۱۸/۱۸ علم الحدیث از ابن تیمیہ: ص ۴۷

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.1 2024

عقل عام کے خلاف کہہ کر رد کرنے کا دعوی کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اس بارے میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اصول حدیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہونے والی حدیث نہ تو قرآن کریم یا سنت رسول کے خلاف ہوتی ہے اور نہ ہی عقل صحیح اس کے قبول کرنے سے آباء کرتی ہے۔

المختصر حدیث نبوی یعنی وحی خفی اور وہی جلی میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ تحقیق حدیث کے لئے درکار تمام اصول محدثین کرام رحمتہ اللہ کے پیش نظر تھے، جن پر پورا اترنے کے بعد ہی انہوں نے کسی حدیث کی صحت کا اور قابل قبول ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب اہل تجدد اور باطل خیالات کے حامل لوگ اگر اپنے نظریات کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لئے اصول سازی کریں اور ان تمام مسائل کو رد کر دیں، جو قرآن وسنت کے خلاف ہیں، تو یہ ایک مسلمان کا رویہ ہوگا، لیکن اگر وہ اس کے برعکس قرآن وسنت کو اندیز یا ودرایت کے سائے تلے، اپنے خود ساختہ اصولوں کے موافق بنانے کی کوشش کریں گے اور اپنے افکار کے خلاف قرآن کریم کی آیات کے منسوخ ہونے کا دعوی کریں، یا اس کے خلاف آنے والی احادیث نبویہ کو رد کرنے کے لئے اصول بنائیں گے تو اس کی بھرپور حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔